سوال نمبر 2 (الف) (i) **نانی بستی کی بہن:**

انجم۔ نانی بستی کی چھوٹی بہن کا نام انجم تھا۔ یہ عبارت میں ہم نانی بستی کو اپنے بیٹے سے بات کرتے ہوئے بولتی نظر آتی ہیں۔ انجم لفظ 'نجم' سے نکلا ہے جو عربی زبان کا لفظ ہے یعنی ستارہ۔

سوال نمبر 2 (الف) (II)

نانی بستی کی چھوٹی بہن، میرٹھ میں بیاہی ہوئی تھی۔
یہ افسانہ اس وقت لکھا گیا جب ہندوستان پر انگریزوں کی
حکومت تھی۔ اس وقت ہندوستان میں متعدد ریاستیں تھیں
اور ہر ایک کا ایک علیحدہ حکمران ہوتا تھا۔ میرٹھ بھی انھی میں سے
ایک ریاست تھی۔ اور عبارت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ
ریاستِ میرٹھ، اس ریاست سے کچھ مسافت پر ہے جدھر نانی بستی
رہتی ہے کہ وہ کئی برس سے ادھر گئی نہیں۔

سوال نمبر 2 (الف) (iii)

نانی لبتی کو اُن سے ملنے کی خواہش اس لیے تھی کیونکہ ان کو اس سے ملے کئی عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ بیاہ کے بعد اپنی بہن سے صرف ایک مرتبہ ملی تھیں وہ بھی تب جب ان کے شوہر خان صاحب ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے نانی لبتی کے لیے اونٹ یا گھوڑے کی شکرم کے ذریعے لے گئے جس سے پردے کا انتظام بھی بخوبی ہو گیا۔ اس کے بعد بہن نے کئی شادیوں پر بلایا مگر پردے اور دیگر دکاوٹوں کی وجہ سے نہ جاسکی تھیں۔

شکرم

سوال نمبر 2 (الف) (iv)

شکرم سے مراد دو پہیوں والی گاڑی ہے جس
جس کو گھوڑے کھینچتے ہیں۔ اس دور میں موٹر کار اتنی عام نہ تھی۔
اور وہ خواتین جو پردے کی سخت پابند تھیں ان کے لیے شکرم بہترین
سواری تھی۔

سوال نمبر2 (الف) (۷)

نانی لبنی کی بہن انجم جو مری میں بیاہی ہوتی تھی، نانی لبنی کی
ملاقات اس سے نئی عرصہ پہلے اپنے شوہر کے ساتھ ہوتی تھی
اب دوبارہ ملنے کی خواہش رکھیں تو اس لیے بیٹے سے کہا کہ گھوڑوں کی
شکرم میں بٹھا دے تاکہ پردے کا بھی انتظام ہو جائے۔ تو بیٹے نے دھوئیں
والی گاڑی یعنی ریل کار پر جانے کی تجویز پیش کی جو کہ نانی لبنی کے لئے بالکل
نئی تھی۔

سوال نمبر 2 (الف) (vi)

دھوئیں کی گاڑی سے مراد ریل گاڑی ہے۔ انگریز جب ہندوستان میں آئے تو ادھر بہت سا خام مال تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کو سونے کی چڑیا بھی کہا جاتا تھا۔ انگریزوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے اور زمین کو لوٹنے کے لئے ریل گاڑیاں شروع کیں۔ ان میں کوئلہ استعمال ہوتا تھا جس کی وجہ سے دھوواں نکلتا تھا۔ سو عام مقامی لوگوں نے اس کو یہی نام دیا۔ انگریز اس سے خام مال برطانیہ میں لے جاتے اور ادھر اس سے دیگر اشیاء بنا کر واپس ادھر لا کر بیچتے۔

سوال نمبر 2 (الف) (vii)

مصنف نے عبارت میں انگریزوں کی نئی حکومت اور ایجادات وغیرہ کا بتایا ہے کہ وہ یہاں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے خام مال لے کر برطانیہ پہنچا رہے تھے۔ اس وقت کے مقامی لوگوں کی معصومیت اور ان کے اس نئے نظام کے ساتھ پیش آنے والی مشکلات کو بھی موضوع بنایا۔ اس وقت کی عورتوں کے سخت پردے کے انتظام کو بھی اجاگر کیا۔

سوال نمبر2(الف)(viii)

سوال نمبر2(ب) (I)

شاعر کے مطابق غریبوں کی جان اور یتیموں کے دل کو قرار آیا ہے۔ یہ دو کمزور طبقے ہیں اور اکثر معاشرے میں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں برتا جاتا۔ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو ان کے مددگار اور غمگسار ثابت ہوئے۔ لوگوں کو ان کے حقوق سے واقف کیا اور خود بھی ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے جس کی وجہ سے ان کی زبوں حالی کے دور کا خاتمہ ہوتا۔

یہ فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

سوال نمبر 2 (ب) (ii)

شاعر حسرت موہانی نے یہ غزل اس وقت لکھی جب وہ حج کا عظیم فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اور چونکہ عرب میں صحرائی علاقہ ہے تو ادھر گرمی کی حدت بہت تیز ہوتی ہے۔ مگر حسرت کو یہ گرمی محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ باد صرصر ان کے لیے باد صبا بن جاتی ہے کیونکہ ہر مشکل، مصیبت، تکلیف پر اللہ کی قرابت، اس کی دوستی، اور اللہ کی آرزو حاوی آجاتی ہے۔ ہر راہ چاہے کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو، انسان کی نظر منزل مقصود کی خوشی پر ہوتی ہے۔

سوال نمبر 2 (ب) (iii)

اردو شاعری میں محبوب کی مسکراہٹ کو پھولوں سے مشابہت دینے کی روایت رہی ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ اے محبوب! تیری ہنسی سننے میں اس قدر دلکش اور اپنی طرف مائل کرنے والی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی پھول کے نکھرے ہوئے رنگ کی مانند ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

؎ اس تبسم کی شرح کیا کیجئے
جیسے کھلتی کلی کا ہو انداز

سوال نمبر 2 (ب) (iv)

اس شعر میں درۂ خیبر کے گرد، قریباً گیارہ ہزار فٹ لمبی چٹانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ بلند و بالا چٹانیں جو اس قدیم درے کو چہار اطراف سے گھیرتی ہیں پرانی داستانوں کی امانت دار ہیں۔ پرانی داستانوں سے مراد قافلے اور فاتحین کے لشکر مراد ہیں جو یہاں سے گزرے۔ ان میں متعدد قافلے اور آریائی، تاتاری، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، بابر اور احمد شاہ ابدالی جیسے عظیم حکمرانوں کی قوموں کی تہذیب کے مختلف رنگ، مذاہب وغیرہ سموئے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی شاید آرزو امانت دار ہیں۔

سوال نمبر 2(ب) (v)

دلاور فگار کہتے ہیں کہ جب میں لاری یعنی جی ٹی بس پر سوار ہوا تو اس میں مسافروں کی دھکم پیل، خود لاری کی خستہ حالت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت، کسی بھی مصیبت کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس بات کی تصدیق لاری پر لکھی تحریر سے بھی ہوتی تھی جو یہ تھی "اللہ نگہبان" یعنی اب اللہ ہی امان اور عافیت کے ساتھ زندہ رکھ سکتا ہے ورنہ تو نتیجہ بھیانک ہوگا۔

سوال نمبر 2(ج) (۱)

ترکیب نحوی / تقطیع

کسی جملے کے افراد کو الگ کرکے ان کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنا ترکیب نحوی کہلاتا ہے۔

شکاری نے شیر مارا۔

یہ **جملہ فعلیہ خبریہ** ہے۔

تقطیع:

مسند / فعل تام ----- مارا

مسند الیہ / فاعل .... شکاری

علامتِ فاعل --- نے

مفعول ------ شیر

سوال نمبر 2 (ج) (II)

مقطع:

مقطع کے لغوی معنی کاٹنے کی جگہ ہے۔
اصطلاح میں مقطع سے مراد غزل یا قصیدے کا وہ آخری شعر جس میں شاعر اپنا 'تخلص' استعمال کرے وہ مقطع کہلاتا ہے

مثال:

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

مندرجہ بالا اشعار غالب اور حسرت کی غزل کے آخری اشعار ہیں جن میں تخلص استعمال ہے، چنانچہ یہ مقطع ہیں۔

سوال نمبر 2 (ج) (iii)

کنایہ: اس کے لغوی معنی اشارہ کرنا کے ہیں۔

علم بیان کی اصطلاح میں وہ الفاظ جو حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں اس طرح استعمال ہوں کہ ان میں تشبیہ کا تعلق موجود نہ ہو، مگر کوئی نہ کوئی تعلق ضرور موجود ہو۔

اجزاء: اس کے دو اجزاء صفت اور موصوف ہیں۔

اقسام: اس کی چھ اقسام ہیں: کنایہ قریب، کنایہ بعید، تعریض، تلویح، رمز اور ایماء و اشارہ۔

امثال:

- کنایہ قریب: بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ - قسمت میں قید لکھی تھی فصل بہار میں
- کنایہ بعید: صبح آیا جانب مشرق نظر - اک نگار آتشیں رخ، سر کھلا
- تلویح: مگس کو باغ میں جانے نہ دیجیو - کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا
- رمز: میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد - سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔

سوال نمبر 2 (ج) (iv)

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 1) **نام دیو مالی :**

یہ ایک خاکہ سے لی گئی عبارت ہے جس میں مصنف نے ایک محنتی اور دل لگا کر کام کرنے والے مالی کا ذکر کیا ہے۔ اس مالی کو اپنے کام سے بے پناہ محبت تھی۔ عشق تھا۔ عشق میں لگن، تڑپ اور جذبہ ہوتا ہے۔ عشق انسان کو جنون جیسے جذبے سے سرشار کرتا ہے۔ نام دیو مالی اپنے کام میں ہر وقت مست رہتا تھا۔ نہایت سادہ مزاج اور بھولا بھالا اور انکسار و عاجزی سے بھرپور تھا۔ ہمیشہ خوش رہتا اور ہنوز چہرے پر مسکراہٹ ہوتی۔ یہ اس کی خوبی تھی کہ وہ اتنا عاجز اور انکسار تھا۔ کروفر کی گنجائش میں ہرگز بھی نہیں تھی۔ ہر ایک کا احترام کرتا اور عزت دیتا اور سب کا احترام بھی کرتا۔ **حدیث مبارکہ** ہے مسلمان وہ ہے جو اپنے چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں کا احترام کرے۔ اس میں یہ خوبی واضح نظر آتی تھی۔ وہ غریب تھا اور تنخواہ بہت کم تھی مگر پھر بھی کھلے دل کا مالک تھا۔ نہایت سخی، رحم دل اور دریا دل تھا۔ اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرتا

اپنے لیے تو سبھی جیتے ہیں ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

ہمیشہ بساط سے بڑھ کر دوسروں کی مدد کرتا جو اس کی شخصیت کو اور بھی ممتاز بناتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی غریبوں کی اس قدر مدد کرتے کہ خود بھی مقروض ہوتے تھے۔ یہی اصل نیکی اور عمل ہے جس میں کوئی دکھاوا، کوئی غرض نہ چھپا تھا۔ مگر سادہ خلوص

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت۔ ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر نہ ہو خلوص۔ نیکی سے بدی بس ہے کچھ دور نہیں

نام دیو مالی اور اپنے کام سے نہایت عشق تھا۔ ہاں! ایک مالی کو بھی عشق ہو سکتا ہے کیونکہ یہ کسی کے لیے خاص نہیں کہ امیر ہی کو ملے بلکہ اللہ کی لوگوں پر خاص مہربانی تھیں۔

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 2)

میدانِ وفا دربار نہیں، یہاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

وہ نہایت لگن اور خوشی سے کام کرتا اور اللہ کی دی ہوئی ودیعت کا بھی بھرپور استعمال شوق، لگن اور عشق سے کرتا۔ عشق سے دل میں جنوں اور سر میں سودا پیدا ہوتا ہے جو انسان کو دنیا اور مافیہا سے الگ کر دیتا ہے۔

اِک جنوں ہے کہ باشعور نہیں — اِک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے

وہ کام میں اس قدر غرق ہوتا کہ ایک مرتبہ شہد کی مکھیوں کی یورش باغ میں آ گئی باقی سب تو بھاگ کر چھپ گئے مگر دلو کو کوئی پرواہ نہ تھی سوائے اپنے پودوں کی۔ وہ کام میں لگا رہا اور مسلسل کرتا رہا۔ مرنے سے بے خبر۔ اس بات سے بھی بے خبر کہ اس کی دنیا میں آخری لمحات آن چلے تھے۔ ان مکھیوں نے اس مصروف نام دلو کو دیکھا اور اس پر جھپٹ پڑیں۔ کاٹ، کاٹ کر اس کو بے دم کر دیا اور اس کی روح اپنے پسندیدہ کام کرتے ہوئے پرواز کر گئی۔ شاید اسے ہی کہتے ہیں عشق کی خاطر جان دینا؟ شاید یہی وہ جذبہ ہوتا ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے، وہ جذبہ جو اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی کنجی ہے۔ سچ کو ہی لگتا ہے اور اگر ایسا ہے تو میرے خیال میں یہ ہی صحیح طریقہ اور عمدہ طریقہ ہے جینے کا کہ عشق پر ساری بازی لگا دو۔ چاہے جیت ہو یا ہار ہو۔

گر بازی عشق کی بازی ہے تو جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اور اگر اس عشق کے راستے میں جان چلی جائے تو یہ اتنی بڑی قربانی نہیں ہے اس خوش دل والے اور عشق سے بھری ہوئی زندگی اگرچہ مختصر کے لیے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

تو یہ ثابت ہوا کہ تخلیق انسان کا مقصد اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت

[illegible]

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 1)

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال نوجوان نسل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تم کو اپنے آبا سے نسبت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ تم ان کے بالکل متضاد شخصیت کے مالک ہو۔ شاعر کہتے ہیں کہ تیرے آبا کام کر کے دکھانے والے تھے نہ کہ تمھاری طرح باتیں بنانے والے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ "حرکت میں برکت ہے۔" اور تم کیا ہو؟

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو - بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

تیرے آبا اپنی بات کے پکے اور فوراً عمل کرنے والے لوگ تھے۔ وہ حرکات و سکنات سے خود کو ثابت کرتے کیونکہ زندگی حرکت ہی کا نام ہے۔ اور تم، تمھارا تکیہ کلام ہے "پدرم سلطان بود" (میرا باپ بادشاہ تھا) وہ اپنی سیرت کے پکے اور سچے لوگ تھے۔ ان کا اخلاق، سیرت کی خوبصورتی پر ستک تا عکس سی بات تھی۔ مگر تمھیں دیکھ کر لگتا نہیں کہ تم ایسے کسی بھی کام کے قابل ہو۔

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے - تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے - تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر - اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر۔

تیرے آبا اسلام کی روایات کے پاسدار، سچے مومن تھے اور ان میں ہمدردی، سچائی جیسی خصوصیات شامل تھیں۔ وہ حرکت کرنے والے جہاں گیر، جہاں دار، جہاں بان اور جہاں آرا تھے اور تم! دیکھو خود کو، مسلمان تو شاید تم ہی ہو گئے۔

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود - ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود

تمھیں اپنے آبا سے نسبت کا کوئی حق نہیں۔ ان کے اندر پائی جانے والی ذرہ برابر بھی خصوصیت تم میں نہیں۔ تم معاشی، معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور سب سے بڑھ کر مذہبی بدحالی کے شکار ہو جو زوال پذیر ہے اور کچھ نہیں۔ اگر تم اپنے آبا کے کارناموں کا سو فیصد بھی خود کو چھونے سے بھی تم محسوس کر دو گے

نسخۂ دہر کو باطل سے مٹایا کس نے؟ میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟

نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟ میرے قرآں کو سینے سے لگایا کس نے؟

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو؟ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

گنوا دی ہم نے اسلاف سے جو میراث

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 2)

شاعر مشرق کہتے ہیں کہ اسلاف' آباؤ اجداد' اپنے بزرگوں سے ہم نے وراثت میں عظیم الشان حکمت لی تھی وہ ہم نے گنوا دی کیونکہ ہم نے اصل گنوا دی ہماری اصل دین اسلام، ایمان ہے۔ مگر مسلمانوں کو ان کی سیاست سے الگ اس لیے کیا گیا کیونکہ انہوں نے اسلاف کی روایات اور دین کی حفاظت نہ کی

باپ کا علم نہ اگر بیٹے کو ازبر ہو۔ پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

ہم جس آسمان پر بیٹھے تھے اس سے ہمیں گرا دیا گیا کیونکہ ہم اس بلندی کے قابل نہیں رہے تھے پست لوگ، پستی ہی کے حقدار ہوتے ہیں۔ ہم نے اسلام کو چھوڑا، قرآن کو چھوڑا، جب اسلام یعنی مکمل ضابطہ حیات کو چھوڑا تو حکومت چھنی، سیاست چھنی، جاگیریں چھنیں، اخلاق ختم ہوئے اور ہم بے کار مرغیوں کی طرح بیٹھے رہ گئے۔ مگر دیکھا جائے تو ہونا تو یہی چاہیے تھا! کیا ہم جیسے کاہل لوگ اب اس عظیم سلطنت کے حقدار تھے؟ ہرگز نہیں!

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اللہ اگر دینا چاہیں تو حکومت واپس دے دیں مگر ہم اس قابل ہی نہیں

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں۔ راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں۔ جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں۔ ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

زبوں حالی کے شکار' اپنے شکار' کاہل مسلمان کو اس سبب کو بیان کیا گیا ہے کہ کیوں وہ اب حکمران نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

موت بھی زندگی میں ڈوب گئی۔

سوال نمبر5 (صفحہ نمبر1)

اس شعر میں شاعر نے دنیا کی مشکلات، آلام اور مصائب کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ دنیا میں اتنے دکھ، اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب محسوس ہوتا ہے کہ موت جس کی تکلیف کو بہت سخت بیان کیا گیا ہے، وہ بھی اس کے سامنے کچھ نہیں ہوگی۔ کہتے ہیں کہ اتنے دکھ جھیلے، اتنی تکلیفیں اٹھائیں کہ اب یقین نہیں آتا ہے کہ اس سے بڑی کوئی مصیبت مجھ پر ٹوٹ سکتی ہے۔

ٹل گئیں غالب بلائیں تمام - اِک مرگِ ناگہانی اور ہے

یعنی شاعر کا کہنا ہے کہ جدھر اتنے مصائب جھیلے، اتنی مصیبتوں، دکھوں کا سامنا کیا، وہاں کچھ اور کیوں نہیں۔ عموماً تو لوگ موت سے ڈرتے ہیں کہ دردناک ہوگی مگر شاعر کو اب موت کی طرف بے حسی اور بے دلی کے علاوہ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی خواہش ہے کہ مر جاؤں جلدی جلدی اور ان تمام مصیبتوں سے آخر کار جان چھوٹ جائے مگر پھر بھی زندہ ہوں اور مصیبتوں کا سامنا کر رہا ہوں

مرتے ہیں خواہش میں مرنے کی - موت آتی ہے پر نہیں آتی۔

یہ روز روز کے مصیبت بھرے دنوں والی زندگی جس میں مجھے ہر روز مرنا پڑتا ہے، اب اس سے تنگ ہوں۔ یعنی زندگی کی ہر ایک جو کہ مصیبتوں اور دردوں کے لیے ہے یہ بہت زیادہ ہے۔

کہوں کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے - مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یہ دنیا، اور یہ تکلیف دینے والی زندگی گویا میری قبر ہیں اور میرا نہیں خیال اس سے گہری اور تکلیف دہ حالت میں میں ہو سکتا ہوں۔

یہ دنیا ہے میری کہ مرقد ہے میرا - یہاں بھی اندھیرا وہاں بھی اندھیرا

اس شعر کا ایک معنی یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ مرنے کے لیے انسان کو جینا پڑتا ہے کیونکہ ہر شے کی ضد موجود ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔
بعض اس کو سرنگ سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں مسافر گھو پر آئے اور پھر دوسرے راستے سے واپس چلا جائے۔ دونوں معنی موزوں ہیں۔

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 2)

ہے یہ دنیا عمل کی جولاں گاہ

ادھر شاعر نے کنایہ استعمال کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دنیا حرکت و عمل کی جولاں گاہ یعنی گھوڑے دوڑانے کا میدان ہے۔ یہ ایسی جگہ نہیں جیسے کوئی شراب خانہ یا درویش کے تعلیم حاصل کرنے کی جگہ ہو مگر حرکت و سلامت کی جگہ ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں - ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا محض ایک میکدہ یعنی شراب خانہ نہیں جہاں انسان نیم مدہوش رہے، بے ہوشی اور بے ہوش لوگوں کی اس دنیا میں جگہ نہیں۔

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں بیدار رہو - ہم نے کر دی ہے خبر تم کو خبردار رہو

نہ ہی یہ کسی درویش کی درسگاہ ہے کیونکہ درویش صرف علم سیکھتا ہے، عمل وہ بھی نہیں کرتا - وہ صرف خود کو بچاتا ہے حالانکہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد بھی حیثیت انسانی ہیں جن سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ **حدیث ہے:**

"دنیا احکام الٰہی کی فرمانبرداری اور خلق خدا کی خدمت کا نام ہے۔" یہ دنیا تو عمل کی جگہ ہے۔ زندگی کیونکہ عمل ہی کا نام ہے۔ علم کے ساتھ عمل بھی تو کرو۔

جمع کر نیک اعمال یوں کہ مسافر جیسے - بیٹھتا ہو جو کر اسباب سفر لیتا ہے۔

بلکہ یہ دنیا جولاں گاہ ہے گھوڑے دوڑانے کی جگہ۔ حرکت کی جگہ۔ کیونکہ حرکت میں برکت ہے، حرکت و عمل ہی کو اصل زندگی ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی - یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اگر ہمیں اللہ نے عمل کا حکم صلاحیت دی ہے تو پھر کرتے کیوں نہیں کیوں باتیں بناتے ہیں کیوں اللہ کی دی گئی دولت استعمال نہیں کرتے؟

زندہ ہیں تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح - مردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

اگر انسان کو عمل کرنے کی صلاحیت ہے تو اس کو استعمال کرے۔ اگر انسان عمل کرنا چھوڑ دے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی منزل تک پہنچ گیا ہے، اور اس کی زندگی رک گئی ہے، وہ ایک مرے ہوئے مردے سے کم نہیں! الو عمل و حرکت کرو

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 1)

سچ کی برکت

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب اسلام کئی علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ بغداد تعلیم کا بڑا مرکز تھا۔ جگہ جگہ سے لوگ، لمبی مسافت طے کر کے ادھر تعلیم حاصل کرنے جاتے کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
تعلیم حاصل کرو چاہے تمھیں چین کیوں نہ جانا پڑے۔
اسی دور میں ایک گاؤں میں ایک لڑکا اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں مسلمان تھے اور لڑکے کی ماں نے اس کی تربیت بہت اچھے سے کی تھی۔ ہمیشہ سچائی، دیانت داری کا سبق دیا۔ کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے) سو جب بچہ اس عمر کا ہوا کہ اس کو تعلیم دی جائے تو اس کی ماں نے اس کو بغداد کے ایک قافلے کے لئے ان کے ساتھ روانہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ جب ساری تیاریاں ہو گئیں تو بیٹے کی ماں نے اس کے کپڑوں میں چالیس اشرفیاں سی دیں۔ اور جب جانے لگا تو نصیحت کی کہ "کبھی جھوٹ نہ بولنا اور ہمیشہ سچ کا سہارا لینا"۔ بچے نے ماں کو الوداع کیا اور قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ قافلہ کئی دن تک سفر کرتا رہا۔ تقریباً آدھا سفر طے ہو گیا تھا۔ ایک شام سب بڑے اور بچے آرام کر رہے تھے کہ اچانک سے صدا اٹھی "ڈاکو! ڈاکو!"۔ یہ سن کر سب ڈر اور سہم گئے۔ قافلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور افراتفری کا عالم تھا۔ بہت سے ڈاکو تھے اور ہر کسی کے پاس جا کر اس کے پاس موجود قیمتی چیزیں برآمد کرتے ہوئے بڑے بڑے تھیلوں میں ڈال رہے تھے۔ کچھ لوگ دینے سے

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 2) سنانی تھے اور کوئے اپنا سامان چھپا رکھا تھا۔ ایسے میں
ایک ڈاکو اس بچے کے پاس آیا اور اس سے سوال کیا: "تمہارے پاس کیا ہے؟"
بچے نے سچ سچ جواب دیا: "چالیس اشرفیاں۔" ڈاکو تھوڑے حیران ہوا اور
محسوس کیا کہ لڑکا اس سے مذاق کر رہا ہے تو زور کا مارا اور کہا "سچ سچ بتاؤ!"
بچے نے پھر کہا: "چالیس اشرفیاں ہیں جو میرے کپڑوں میں سلی ہیں۔" ڈاکو اس
بار اور بھی حیران ہوا اور ڈاکوؤں کے سردار کے پاس لے گیا اور صورتحال
بتائی۔ سردار نے جب پتہ لگوایا تو سچ میں اشرفیاں نکل گئیں۔
اس نے بچے سے پوچھا: "اے بے وقوف! ہمیں کیوں بتایا؟"
وہ جواب میں بولا: "میری ماں نے مجھے سچ بولنے کی نصیحت کی تھی اس لیے
میں نے بتا دیا۔" یہ سن کر ڈاکو دم بخود رہ گیا۔ اس کے ذہن میں
خیال ابھرا کہ یہ چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کی نافرمانی مشکل حالات میں بھی
نہیں کرتا اور میں؟ میں تو اپنے خالق اللہ کی نافرمانی کر رہا ہوں۔
وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے سب ڈاکوؤں کو اکٹھا کیا۔ سب
کو قصہ سنایا۔ اور کہنے لگا: "سب کو سامان واپس کر دو۔ آج سے
میں کوئی ڈکیتی نہیں کروں گا کہ یہ حکمِ خداوندی کی نافرمانی ہے!"
اس طرح سب ڈاکوؤں نے سامان واپس کیا۔ بچے کا شکریہ
ادا کیا۔ اور چل دیے۔ سب نے بچے کے ساتھ خوشی منائی
اور نعرے لگنے لگے۔ سچ میں برکت ہے۔

نتیجہ: الصدق ینجی والکذب یھلک
سچ بچاتا ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 1)

حب الوطن

حب الوطنی سے مراد اپنے وطن سے محبت ہے۔ وطن سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان پیدا بڑھا ہوتا ہے، اپنی ساری زندگی گزاری ہوتی۔ اس علاقے کی زمین، آسمان، لوگوں حتیٰ کہ ہر شے سے اس کو انسیت ہو جاتی ہے۔ اسی کو حب وطن کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دے رکھا ہے۔ ہر انسان کے دل میں یہ موجود ہے چاہے بچہ ہو، بوڑھا ہو یا جوان۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حب الوطن من الایمان (وطن سے محبت ایمان کا جزو ہے)

یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو مسلمان بناتا ہے۔

وطن پہ فدا ہے جو انسان ہے
کہ حبِ وطن جزوِ ایمان ہے

اس جذبہ حب الوطنی کی اہمیت اس قدر ہے کہ یہ ہر انسان میں ہے۔ ہر حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے تھے **مصر کی بادشاہی سے بہتر تو کنعان کا گداگر بنتا ہے**۔ ایک فارسی شاعر نے کچھ یوں کہا،

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت مدینہ کے وقت مکہ چھوڑ کر جا رہے تھے تو کعبے کی طرف دیکھ کر فرمایا، اے مکہ تو مجھے بہت عزیز ہے مگر کیا کروں تیرے بیٹے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ یہاں تک کہ جب ایک شاعر یعنی ذوق کو دکن میں آنے کا کہا گیا تو فرمایا

جانتا ہوں گرچہ دکن میں بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

یہ جذبہ حب الوطنی ہی ہے جو انسان کو ایک ایسا جگہ دیتا ہے جسے وہ صحیح معنوں

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 2)

میں گھر کہہ سکے۔ جدھر کے لوگوں پر وہ بھروسہ کر سکے۔ ان کے ساتھ مل جل کر رہ سکے۔ ایک ایسی جگہ مل جائے جسے وہ دنیا کی بہترین اور خوبصورت ترین جگہ کہہ سکے۔

جنت سے کہیں بڑھ کے حسین میرا وطن ہے۔ سمجھ نہ سکے جو کوئی میرا وطن ہے
سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد
جب تک ہے یہ دنیا باقی قدم قدم آباد

حب الوطنی کے تقاضے کئی ہیں اور ان میں سے سب سے بڑا تقاضہ یہ کہ انسان اپنا تن، من دھن اپنے وطن کے لیے قربان کرنے کے لیے تیار ہو۔

خونِ دل دے کر نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب۔ ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

ہمیں اپنے وطن کو ایک بہتر جگہ بنانے کے لئے محنت اور خون پسینہ بہانا پڑے گا۔

ہم اپنے خون سے صحرا میں گل کھلائیں گے۔ چمن میں کون بہاروں کا انتظار کرے

ہمیں یہ وطن کئی جدوجہد اور اپنے بزرگوں کی انتھک محنتوں کے نتیجے میں ملا ہے۔ یہ آزاد وطن ہمارے لیے جان سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے عشق ہر کسی کو ہونا چاہیے کیونکہ اس کے لیے بہت خون بہا۔

عشق و آزادی، بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
اور آزادی پر تو میرا عشق بھی قربان ہے

1965ء کی جنگ میں تمام ہم وطنوں نے مل جل کر جدوجہد کی اور وطن کی حفاظت کی۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، جوان ہر ہر کوئی تگ و دو میں لگا تھا کہ وطن کی حفاظت کی جا رہے۔ کئی جانیں قربان کیں،

ہو اپنے جسم چن دیں اینٹ پتھر کی طرح
بے در و دیوار ہے لیکن گھر اپنا تو ہے

حب وطن کا تقاضہ صرف جان سے حفاظت کرنا نہیں بلکہ اس کو ترقی

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 3) کی راہوں پر گامزن کرنا بھی ہے۔ طالب علم ہوتے ہوئے ہمیں دن دوگنی رات چوگنی محنت کرنی چاہیئے تاکہ ہمارا وطن ترقی اور خوشحالی کی طرف بڑھ سکے۔

جب پاکستان بنا تھا تو اس میں محنت اور جدوجہد کرنے والوں میں عام عوام شامل تھی۔ جاگیرداروں نے اس میں حصہ نہیں لیا تھا۔ قائد نے کہا تھا ہم ایک تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جدھر ہم اسلامی قانون و ضوابط لاگو کرکے یہ ثابت کر سکیں کہ اسلامی نظام بہترین نظام ہے۔ اس کے لیے عام طبقے کی محنت بہت زیادہ تھی۔ مگر آج اگر ہم اس ملک کی حالت دیکھیں تو سرمایہ دار اور جاگیردار ہی ہر طرف اسمبلیوں میں موجود ہیں جس کام کے لیے ہم نے وطن حاصل کیا وہ کام اب نہیں ہو رہا۔ بلکہ ہمارا کام تھا۔ اپنے وطن کو اسلام کی راہ کی طرف چلانا "نئی تہذیب" کی طرف سے ہٹائیں۔ اسلامی ضوابط پر عمل کریں۔

عہد نو سے لڑنا، طرزِ کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ہمیں چاہیے کہ ہم ایک قوم کی طرح ایک صحیح وطن کی طرح عام ہم وطنوں کو اپنے ساتھ ترقی کی راہ پر چلائیں۔ صرف انفرادی ترقی نہیں بلکہ اجتماعی ترقی

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ہمیں جدوجہد اجتماعی کرنی ہے۔ وطن کے لیے اور وطن کے بہتر کرنے کے لیے قوموں ہمیں بنانا ہے تاکہ وطن مکمل بن سکے۔

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو۔